

فالو اپ

خود کشی کی شرعی حیثیت اور اس کے دینی، سماجی و معاشی محرکات پر گزشتہ دو کالموں میں گفتگو کر چکا ہوں۔ کالم کی گنجائش کے اندر رہتے ہوئے میں نے کوشش کی ہے کہ حتی الامکان اسے جامع بنایا جائے۔ غالب کے الفاظ میں اس کا مجموعی ردِ عمل کچھ ایسا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی مرے دل میں ہے

تاہم کچھ تجاویز بھی سامنے آئی ہیں، علامہ غلام محمد سیالوی نے کہا: ”آپ نے اولاد کی تربیت میں والدین کی غفلت کا ذکر کیا ہے، لیکن علمائے کرام کی ذمہ داریوں پر گفتگو نہیں کی۔“ میں نے انہیں بتایا کہ کالم کی گنجائش محدود ہوتی ہے، اس لیے تشنگی تو محسوس ہوگی، جو اس شعر کا مصداق ہے:

در میان قعر دریا، تنہا بندم کردہ ای بازی گوی کہ دامن ترکن ہشیار باش

ترجمہ: ”آپ نے دریا کی موجوں کے وسط میں مجھے اس تاکید کے ساتھ تختے پر بٹھا دیا ہے کہ خبردار! دامن پر کوئی چھیننا نہ پڑے۔“ بعض اوقات توجہ کی کمی کے باعث بھی اہم نکات رہ جاتے ہیں۔ ایک ناخوش گوار حقیقت یہ ہے کہ مذہبی مسالک و مکاتب فکر موجود ہیں، یہ آئیڈیل صورت حال نہیں ہے، مگر ایک ناگزیر حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں، وطن عزیز کے معروضی حالات یہی ہیں۔ جماعت التوحید، جماعت المسلمین، انجمن اشاعت التوحید والسنۃ وغیرہ کی طرح جو بھی تنظیمیں مجرد اسلام کے داعی بن کر نمودار ہوئیں، وہ جلد ہی خود بھی ایک مسلک کی صورت میں ڈھل گئیں حتیٰ کہ علامہ جاوید احمد غامدی لبرل اسلام کا عنوان بن گئے۔ الغرض مافوق المسلمک ہونے کا انحصار بندے کے اپنے دعوے پر نہیں بلکہ اس کے عمل پر ہوتا ہے۔ جب آپ سب سے منفرد نظریات کے علمبردار بن جائیں تو مذہبی میدان میں اپنے لیے مستقل جگہ بنانے کی خاطر آپ کو اپنی تحریر و تقریر میں شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے نظریاتی امتیازات پر زور دینا اور بالواسطہ دوسروں کی نفی کرنا ہوتا ہے۔ اہل تشیع علماء جب کسی موضوع پر گفتگو کر رہے ہوتے ہیں تو اپنے ناظرین و سامعین کو مطمئن کرنے کے لیے کہیں نہ کہیں حضرت علی اور امام جعفر صادق رضی اللہ عنہما کا حوالہ ضرور دیتے ہیں۔

خطابات کا ترجیحی موضوع مسلکی امتیازات ہوتے ہیں، میں جب کبھی اندرون ملک یا بیرون ملک ”عقیدہ توحید“ پر گفتگو کرتا ہوں تو دوسرے مکاتب فکر کے لوگ بعد میں منتظمین سے حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ لوگ بھی اس موضوع پر بات کرتے ہیں۔ ہمارے ایک بڑے خطیب و عالم نے ”عقیدہ توحید“ سیمیناروں کا سلسلہ شروع کیا، معلوم ہوا کہ ان کا مرکزی نکتہ تو ٹسل ہوتا ہے۔ حالانکہ توحید کو عنوان قرار دینے کے بعد اُسی کے تقاضوں پر بات ہونی چاہیے، تو ٹسل و استمداد کے عنوان پر الگ سے بات کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اہلسنت کے ہاں پسندیدہ موضوع فضائل ہیں، روایتی سامعین کا ایک طبقہ بھی اسی کا دلدادہ ہے، سو یہ معاش کا بھی مسئلہ

ہے۔ اس سے سامعین کو ذہنی سرور بھی مل جاتا ہے، وہ چار نعرے لگا کر بزمِ خویش سچے عاشقِ رسول بھی بن جاتے ہیں۔ دوسری طرف بعض مناظرِ قسم کے خطباء کا من پسند موضوع ”شرک و بدعت“ ہوتا ہے۔

اس تناظر میں سماجی اور اصلاحی موضوعات پر گفتگو کی گنجائش کم رہتی ہے۔ جب آپ معاشرتی خرابیوں پر بات کریں گے تو سامعین میں سے کسی نہ کسی کو یہ چوٹ اپنے اوپر محسوس ہوگی، کیونکہ یہ اشرافیہ ہمارے درمیان بیٹھے ہوتے ہیں اور بعض صورتوں میں اسی طبقے کے لوگ ان پیشہ ور خطباء کے اصل اسپانسر ہوتے ہیں، اگر انہیں ناراض کر دیا جائے تو گلشن کا کاروبار کیسے چلے گا۔ مذہبی سیاسی جماعتوں کے نزدیک سب سے قابلِ قدر دینی خدمت وقت کے حکمرانوں پر چڑھائی کرنا ہے، یہ سیاست کا سکہ رائج الوقت ہے، آپ جناب سراج الحق سے پوچھ سکتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں: یہ کام بڑے شوق سے کریں، اللہ آپ کو بہت دے تو اس سے دس گنا زیادہ شد و مد سے کریں، لیکن تھوڑا سا وقت نکال کر ہمیں اپنے گریبانوں میں بھی جھانکنا چاہیے کہ معاشرے کی اصلاح میں ہمارا حصہ کتنا ہے۔ میں ایک جلسے میں پنجاب گیا، وہاں شرکاء کے لیے قرعہ اندازی کے ذریعے عمرے کے بارے میں کنکوش کی پیش کش تھی۔ ٹکٹوں کی پیشکش کرنے والے چوہدری اور سینڈھ صاحبان صفِ اوّل میں بیٹھے تھے، میں نے اُن سے کہا: اگر آپ کو اللہ کی رضا کے لیے کسی کو عمرے پر بھیجنا ہے، تو کسی نیک آدمی کا انتخاب کیجیے، صرف اُسے پتا ہو اور آپ کو، اللہ تعالیٰ تو سب ظاہر باطن کا جاننے والا ہے، اس نمود کی کیا ضرورت، شہرت پسندی کو حدیثِ مبارک میں شرکِ اصغر کہا گیا ہے۔ مزید یہ کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو عمرہ کرانا دینی ضرورت نہیں ہے، اس کے برعکس قوم کے ہر بچے کو اچھا مسلمان اور اچھا پاکستانی بنانا سب توفیق اور حسبِ مراتب ہم سب کی ذمہ داری ہے، یہ پیسہ آپ تعلیم و تربیت کے فروغ پر خرچ کریں تو آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا، بعد میں مجھے بتایا گیا کہ جلسے کے منتظم نے اعلان کیا کہ آئندہ ہم صرف تربیتی پروگرام کریں گے، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ آج کل بعض با وسائل پیر صاحبان بھی اپنی مجالس کی رونق دو بالا کرنے کے لیے عمرے کے ٹکٹوں کا سہارا لیتے ہیں، عموماً یہ مجلسیں روایتی اور تعلیم و تربیت سے عاری ہوتی ہیں۔

سو میں تسلیم کرتا ہوں کہ علمائے کرام کا اصلاحِ معاشرہ میں کردار محدود ہے اور منبر و محراب کی فیض رسانی کا دائرہ سمٹ گیا ہے۔ نیز مسلکی موضوعات ان کے لیے سچے ہوئے دستِ خوان کی طرح ہوتے ہیں، آڈیو و ڈیو مواد موجود ہے، اب واعظین اور نعت خوانوں کو حافظے پر بھی زور دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ موبائل سامنے رکھ کر سحرِ خطابت اور حسنِ صوت کا سیل رواں جاری رہتا ہے، پر جوش نعروں اور سبحان اللہ کا وقفہ اسی لیے ضروری ہوتا ہے کہ اسکرین کو اپ ڈیٹ کر دیا جائے، پس مدارس و جامعات میں ائمہ و خطباء کی تربیت کی اشد ضرورت ہے۔ میں 1965 سے ایک ہی مسجد میں خطابت کر رہا ہوں، میرا تجربہ یہ ہے کہ نوجوان بزرگوں کی بہ نسبت بات زیادہ توجہ سے سنتے ہیں، کبھی سوال بھی کرتے ہیں اور سوال وہی کرے گا جو توجہ سے سنے اور معنی پر غور کرے، نعرے باز سامعین کو اس کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اس لیے آج کل جلسوں میں ایکوسائونڈ لازمی عنصر ہو گیا ہے، جو آواز کی بازگشت سے ایک طرح کی نفسگی کا تاثر پیدا کرتا ہے، ایسے میں معنی پر غور کون کرے گا، بعض اوقات الفاظ صحیح طور پر سمجھ بھی نہیں آتے۔ گزشتہ سال امریکہ میں ایک اجتماع میں نعت پڑھی جا رہی تھی، سبحان اللہ کی صدائیں بھی آرہی تھیں، نوٹ بھی نہجوا رہو رہے تھے، میں نے بعد میں اپنی گفتگو

کے دوران سامعین سے اُن اشعار کا مطلب پوچھا، تو سب خالی الذہن تھے۔

الحمد للہ علیٰ احسام! ہمارے سب بھائیوں کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت سے نوازا ہے، میرے برادر بزرگوار انجینئر جمیل الرحمن قاضی ہم سب سے زیادہ ذہین ہیں، وہ میری تحریروں کو پڑھتے بھی ہیں اور مشورے بھی دیتے ہیں، وہ ہمارے خاندان کے سرپرست ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کا سایا تادیر سلامت رکھے۔ انہوں نے بتایا: حالیہ برسوں میں قتل کے واقعات کا تناسب بہت بڑھ گیا ہے، ہمارے آبائی ضلع مانسہرہ کے وہ علاقے جہاں برسوں میں کوئی ایک آدھ قتل کا واقعہ ہوتا، اب وہاں کے مقامی اخبارات روزانہ قتل، چوری، ڈکیتی اور دیگر جرائم کے واقعات سے بھرے ہوتے ہیں۔ میں نے بھائی جان سے کہا: جناب عمران خان تو بتاتے ہیں کہ پشتونخوا کی پولیس مثالی بن گئی ہے، جرائم کم ہو گئے ہیں، تھانوں میں ایف آئی آر کا اندراج کمپیوٹرائزڈ ہے۔ انہوں نے کہا: کمپیوٹر ہوا سادہ کاغذ، جب ایف آئی آر درج ہی نہیں ہوگی، تو اعداد و شمار پر کشش نظر آئیں گے۔ پولیس اور انتظامیہ عدالت سے باہر جرگہ بٹھا کر معاملات طے کر دیتی ہے، جرگے میں علاقے کے بااثر لوگ جمع ہوتے ہیں، وہ اپنے دباؤ سے معاملات طے کر دیتے ہیں اور راوی چین لکھتا ہے۔ بااثر اور داد گیر لوگوں کے جرگے میں کمزور لوگ حد سے تجاوز نہیں کر سکتے۔

غیرت کے نام پر ماورائے عدالت قتل کے واقعات رپورٹ نہ ہونے کا ایک سبب سابق صدر پرویز مشرف کا ”تحفظ نسواں ایکٹ“ ہے، اس کی رُو سے مغرب کی طرح پس پردہ زنا بالرضا کو قانونی تحفظ مل گیا ہے، پہلے ایسے واقعات حدود قوانین کے تحت رپورٹ ہو جاتے تھے، پولیس اور عدالت کا سلسلہ شروع ہو جاتا، لوگوں کے جذبات ٹھنڈے ہو جاتے اور مصالحت کی کوئی صورت نکل آتی تھی۔ قانونی راستہ بند ہونے کے سبب لوگ ماورائے عدالت خود اقدام کرتے ہیں، اب ایسے واقعات بہت کم رپورٹ ہوتے ہیں، اس کا وبال سابق صدر اور اُن کی پارلیمنٹ پر بھی ہوگا۔ کیونکہ جب اپنے لوگوں کے سماجی پس منظر اور معروضی حقائق کو نظر انداز کر کے محض لبرل ازم کے شوق میں قوانین بنائے جائیں گے، تو ناکامی اُن کا مقدر ہے۔ فیشن کے طور پر پنجاب حکومت نے شوہروں کو الیکٹرک رنگ پہنانے کا قانون بنایا تھا اور بیوی کو اختیار دیا تھا کہ وہ زیادتی کرنے والے شوہر کو گھر میں داخل نہ ہونے دے، کوئی بتائے کہ آج تک کس شوہر کو وہ رنگ پہنایا گیا ہے۔

یہاں تک لکھ پایا تھا کہ گزشتہ کالم کے حوالے سے علامہ غلام محمد سیالوی نے فون پر بتایا: میری نشاندہی پر وزیر اعلیٰ پنجاب نے قبرستانوں کی حالت پر توجہ دی ہے، چار دیواری بنانے کے لیے متعلقہ ایم پی ایز کو فنڈز دیے ہیں اور لاہور میں شہر خموشاں کے نام سے ایک منظم قبرستان بنایا ہے، اس میں غسل سے لے کر کفن دفن تک ساری سہولتیں دستیاب ہیں، یہ قابل تحسین ہے، دیگر صوبائی اور مقامی حکومتوں کو بھی اس حوالے سے کام کرنا چاہیے۔ زندہ لوگ تو اپنے حقوق کے لیے کچھ نہ کچھ فریاد کر لیتے ہیں، مردوں کی حالت زار پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ قبرستان سے متعلق کالم پر قارئین کی بہت سی میلز آئی ہیں، یہ واقعی قابل توجہ مسئلہ ہے، برطانیہ سے آئے ہوئے ایک سوال کے جواب میں، میں نے علماء کی تصدیقات کے ساتھ قبرستان کے حوالے سے ایک تفصیلی فتویٰ لکھا ہے جو ہمارے فیس بک پیج پر پڑھا جاسکتا ہے۔

